مسلمانوں کے نظام ہائے تعلیم کا ایک تعارف

شہزاد چنا*

ABSTRACT:

Education in the largest sense is act or experience that has a formative effect on the mind, character, or physical ability of an individual. In its technical sense, education is the process by which society deliberately transmits its accumulated knowledge, skills, and values from one generation to another. This article attempts an introduction of educational systems based on their religious philosophies.

کسی بھی قوم کی تعلیمی حکمت عملی کی اساس، اس کے بنیادی نظریات اور تصورات پر قائم ہوتی ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ علم ہر تخلیق کی کنجی ہے۔ تعلیم ذہنوں کو جلا دیتی ہے، خیالات کو متحرک کرتی ہے اور انسان میں تخلیق و ایجاد کا جذبہ بیدار کرتی ہے، قوت اختراع کو جگاتی ہے اور عمل کی اہلیت بڑھاتی ہے۔ وجود میں خوابیدہ گہری تخلیقی قوتوں کو جگاتی ہے اور بروئے کار لاتی ہے۔ تخلیقی ذہنوں میں تخلیقی امنگوں کے ولولے پیدا کرتی ہے۔ ہر قوم کے عروج میں اس قسم کی تعلیم نے اعلیٰ کردار ادا کیا ہے۔ علم سے بے بہرہ قومیں آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی گئیں اور پھر ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ علم کا جو حقیقی تصور ہمیں اسلام کی تعلیمات میں ملتا ہے وہ آج کی دنیا کی رہنمائی اور قیادت وسیادت کے لیے ایک اعلیٰ مثال اور عملی نمونہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ زمین پر انسان کے کردار اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تخلیق آدم کا فیصلہ اور حضرت آدم کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا اس رشتے کا مظہر ہے: **انی جاعل فی الارض خلیفة** (۱) (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے فیصلے کے معاً بعد: **وعلم آدم الاسماء کلھا** (۲) (اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے) اس حقیقت کا غماز ہے کہ زمین پر خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا تعلق جس صلاحیت اور تیاری سے ہے اس کی بنیاد علم ہے۔

تعلیم کا تخلیقی نقطہ نظر:

نامور ادیب محمد احمد صدیقی کے مطابق: ''تعلیم، ارتقائی، انقلابی، ایجادی، تعمیری، اجتہادی، متحرک اور ہمہ گیر نقطہ حیات پیش کرتی رہتی ہے۔ وہ ماضی حال اور مستقبل کو ایک زنجیر میں منسلک کر کے محوخرام ہوتی ہے۔ یہ مایوسی، قنوطیت پرستی، ناانصافی اور خلفشار کو دور کر کے ایک ارتقا پذیر اور صالح معاشرہ کو جنم دیتی ہے۔ اس کے نزدیک روحانی و مادی اقدار

* ڈاکٹر، ریسرچ انویسٹی گیٹر، ریجنل دعوۃ سینٹر (سندھ) کراچی، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
برقی پتا: shahzadchanna@yahoo.com
تاریخِ موصولہ: ۱۲/جنوری ۲۰۱۲ء

ایک دوسرے کے وجود کے لئے تخلیق کی گئی ہیں تا کہ عقل و وجدان کی ہم آہنگی سے مکمل زندگی وجود پذیر ہو سکے۔ یہ تعلیم ''گڈ مین'' کو پہلے وجود میں لانا چاہتی ہے جو ''سپر مین'' کی لائی ہوئی خون ریزیوں کو ختم کر کے امن پسند ماحول کو تخلیق کرے گی اور دنیا کو امن و سلامتی اور عمل کا درس دے کر اسے ترقی کی منزلوں کی طرف دعوت دیتی رہے گی۔''(۳)

اسلام کا نظریہ تعلیم:

اسلام کے تصور علم میں مرکزیت اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی دی ہوئی ہدایت کو حاصل ہے، لیکن رب سے اس تعلق کے ساتھ خالق کائنات نے خود میں جو قوتیں اور امکانات رکھے ہیں، ان تک رسائی اور ان سے استفادہ بھی اس کا حصہ ہے۔ البتہ اسلامی اور جاہلی تصور میں فرق یہ ہے کہ جاہل تصور میں انسان کائنات میں پائی جانے والی قوتوں، وسائل اور امکانات میں کھو جاتا ہے اور رب سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جبکہ اسلام کے تصور علم میں رب سے رشتے کی استواری اور اللہ کی رہنمائی کی مرکزیت کے ساتھ کائنات میں پائی جانے والی تمام قوتوں اور امکانات کی تسخیر شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولین وحی میں اس نازک مگر انقلابی تصور کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا گیا ہے اور فرمایا گیا:

اقرا باسم ربک الذی خلق. خلق الانسان من علق. اقرا وربک الاکرم. الذی علم بالقلم. علم الانسان ما لم یعلم. (۴)

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)۔''

ان پانچ آیات میں مرکزی کردار خالق ارض وسما کا ہے اور علم کا اصل سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اسی نے اسما کے علم سے نوازا اور خیر و شر کے پیمانوں سے رہنمائی فرمائی۔ اس لیے علم، زندگی اور تہذیب و تمدن کے لیے اصل مرکز و محور اللہ اور اس کا دیا ہوا علم ہے۔

نامور ماہر تعلیم پروفیسر سید محمد سلیمؒ لکھتے ہیں: ''تعلیم لکھنے اور پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ اس کو تو خواندگی کہتے ہیں۔ یہ تو ایک قسم کی ہنرمندی و کاریگری ہے۔ یہ تو دنیا کی تمام قوموں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ تعلیم خواندگی، ہنرمندی، معلومات اندوزی سے بہت ارفع و اعلیٰ شے ہے۔''(۵)

تعلیم کا مفہوم:

تعلیم عربی زبان کے لفظ علم سے ماخوذ ہے، علم کے معنی جاننا پہچاننا یا کسی حقیقت کا ادراک حاصل کرنا ہے اور تعلیم کے معنی بتانا، پڑھانا، بار بار اور کثرت سے خبر دینے کے ہیں۔ اس حد تک کہ بتائی جانے والی بات مخاطب کے ذہن میں بالکل واضح ہو جائے۔ اس کا مادہ ''ع ل م'' علم ہے اور باب تفعیل میں تعلیم آتا ہے۔ منور جہاں رشید اپنی کتاب میں لکھتی ہیں: ''تعلیم خود آگہی کی اہلیت دیتی ہے، یہ پرامن تخلیقی زندگی گذارنے کا شعور دیتی ہے۔ ہر حال میں جذبات میں سکون اور جذباتی اتحاد قائم رکھنے کی اہلیت دیتی ہے۔ زندگی کے تخلیقی مقاصد کا تعین کرتی ہے۔ زندگی با مقصد فرائض کو سرانجام دینے کی تربیت دیتی ہے۔

تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ تعلیم کا مقصد مثبت سوچ پیدا کرنا ہے، تخلیقی شخصیتوں کا ارتقا کرنا ہے اور فرد میں اس ارتقا کی اہلیت پیدا کرنا ہے۔فرد کی با مقصد اور پرامن زندگی معاشرے میں مقصدیت و امن کی محرک ہوتی ہے۔"(۶)

اسی طرح پروفیسر سید محمد سلیمؒ تعلیم کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "تعلیم وہ اجتماعی عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ نوخیز نسلوں کو اسلامی تصورِ حیات سکھاتا ہے۔"(۷)

نامور دانشور نعیم صدیقی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۲ء) لکھتے ہیں کہ تعلیم کی ماہیت یا تعریف یہ ہے کہ ایک نسل، دوسری نسل کو یا ماضی مستقبل کو، یا بڑی عمر کے لوگ چھوٹی عمر کے بچوں اور نوجوانوں کو ذہنی و اخلاقی وراثت منتقل کرتے ہیں جس وراثت کا کچھ حصہ انھوں نے سابق نسل سے لیا ہوتا ہے اور کچھ حصہ اپنے تجربوں، مشاہدوں اور قیاسات اور ماورائے قیاس ذرائع سے حاصل کیا ہوتا ہے۔(۸)

اسلام سے پہلے جاہلیت کا دور:

اسلام سے پہلے دنیا پر جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مذہب کی تعلیم اور دنیاوی علوم کی تعلیم کا رخ توہمات و جادو کی طرف تھا۔تعلیم کے ماہرین عام طور پر جادوگر، پروہت، راہب اور ٹوٹے ٹوٹکوں کے جاننے والے تھے۔عوام روحانی معرفت اور علم و دانش سے محروم تھے۔وہ طلسماتی اثرات میں بھٹکے ہوئے تھے۔معاشرہ جہالت میں ڈوبا ہوا اور قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔

ظہورِ اسلام کے بعد تعلیم:

چھٹی صدی عیسوی میں محمد رسول ﷺ نے مبعوث ہو کر اور ایک نیا روحانی پیغام دے کر روحوں کو قرار دیا۔انسانی برادری کے دلوں میں گہرا سکون پیدا کیا۔توحید کا پیغام دیا۔انسانی ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھر اور لکڑی کے بتوں کی بے بسی ثابت کی۔روح و عقل کے ذریعے اللہ کی عظمت کے ثبوت پیش کیے۔علم و دانش کی روشنی سے دنیا کو روشن کیا۔یہی وجہ کہ ہمیں بعد میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:"اسلام نے عربوں کو تہذیب و تمدن کے بلند معیار پر پہنچایا۔ان میں تعلیم کا شوق پیدا کیا جس سے وہ پہلے بہرہ ور نہ تھے۔"(۹)

قرآن پاک میں ایک اور جگہ محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد کتاب و حکمت کی تعلیم دینا قرار دیا گیا ہے:"حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا، جب کہ انہی میں سے ایک پیغمبر ان میں بھیجا، وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں۔اور ان لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتلاتے ہیں۔اور بیشک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"(۱۰)

عہدِ نبوی میں تعلیم:

اسلام سے پہلے عرب میں گنتی کے چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔اسلام نے علم کو عام کیا۔"ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم محمد ﷺ خود تھے۔اور پہلی درس گاہ مسجد تھی۔مدینہ منورہ کی وہ چھوٹی سی مسجد جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور تھی۔قرآن پاک پہلی درسی کتاب تھی۔مسجد نبوی اللہ کی عبادت کا مقام بھی تھی اور علم کی اشاعت کا مرکز بھی۔طرز تدریس وعظ تھا۔مقصد

تعلیم عملِ صالح تھا۔ دنیاوی زندگی میں ہر عمل کو عملِ صالح کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تا کہ زندگی تقدس مآب ہو۔"(۱۱)

"مکہ معظّمہ میں "دارِارقم"، مسلمانوں کا پہلا مدرسہ تھا۔ یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں مسلمان چھپ چھپ کر جمع ہوتے تھے اور عبادت میں مصروف ہوجاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ پر جب کوئی قرآن پاک کی آیت یا سورۃ نازل ہوتی تو وہ یہ آیات طالبِ درس کو سنایا کرتے تھے۔ مسجد میں ایک چبوترہ تھا جو کہ تاریخ اسلام میں "صفہ کا چبوترہ" کے نام سے مشہور ہے۔ جو لوگ یہاں پر تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے وہ "اصحاب صفہ" کہلاتے تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت کی نگرانی معلم انسانیت خود فرماتے تھے۔"(۱۲)

اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ مسجد کا اسلام سے گہرا تعلق ہے۔ مسجد عبادت گاہ ہے، جہاں مسلمان نمازیں ادا کرتے ہیں، جہاں بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ مسجد تعلیم گاہ ہے، جہاں استاد شاگرد جمع ہوتے ہیں اور درس تدریس کی محفل جمتی ہے، جہاں علما وعظ ونصیحت کرتے ہیں اور دعوت وارشاد میں مشغول نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ تعلیمی کے حوالے سے پروفیسر سید محمد سلیمؒ لکھتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ عبادات ہوں، معاملات ہوں، معیشت ہو، معاشرت ہو، تعلیم ہو، تربیت ہو، سیاست ہو، اخلاق ہو، انفرادی زندگی ہو، اجتماعی زندگی ہو، غرض کہ ہر پہلو کے لیے رسول ﷺ کا اسوۂ حسنہ بہترین نمونہ ہے۔.... دوسرا یہ کہ: رسالت کا اصل فریضہ انسانوں کو تعلیم دینا ہے۔ اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرنا ہے، اسوۂ رسالت کی پیروی کرنا جس طرح عقائد، عبادات اور معاملات ضروری ہیں اسی طرح تعلیم وتربیت بھی اسوۂ رسول ﷺ کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ قانون اور سیاست کے میدان میں جس طرح اسوۂ رسول ﷺ وضعی علوم سے افضل اور برتر ہے، اسی طرح تعلیم وتربیت کے میدان مس بھی رسول کا اسوۂ تعلیمی افضل اور برتر ہے۔"(۱۳)

اس دور کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ: "عہد نبوی ﷺ میں قرآن وسنت کے علاوہ نشانہ بازی، حساب، طب، علم ہیئت، علم انساب، تجوید قرآن اور عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جہاں مردوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا وہاں عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کے حوالے سے بھی آپؐ کے واضح ارشادات کتابوں میں موجود ہیں۔ "ایک دفعہ عورتوں نے آپؐ سے شکایت کی کہ مرد علم سیکھنے میں ہم سے سبقت لے گئے ہیں۔ آپ ہفتے میں ایک دن ہمیں بھی تعلیم وارشادات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔ آپؐ نے وعدہ فرمایا اور انھیں وعظ وتلقین فرمانے لگے۔"(۱۴)

یہی وجہ ہے کہ ہمیں اسلام کے ابتدائی دور میں تعلیم کے فروغ اور علم کے میدان میں نامور صحابیات کے کارنامے نظر آتے ہیں۔ "تعلیم کے فروغ کے لئے آنحضرت کی ازواج مطہرات بھی حضور ﷺ کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے علمی کمال کے بارے میں عظیم محدث کا خیال ہے کہ اگر تمام صحابہ کا علم ایک پلڑے میں ہو اور حضرت عائشہؓ کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو عائشہؓ کے علم کا پلڑا بھاری ہوگا۔"(۱۵)

خلافت راشدہ کا نظام تعلیم:

خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی سلطنت بہت زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ ''خلفائے راشدہ میں تعلیم کا مقصد وہی تھا جو کہ عہد نبوی میں تھا۔ معلمین تعلیم کے ذمے طلبا اور عوام کی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی بے حد کوشش کرتے تھے۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ تھے اور وہ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے، کیونکہ ان کو گوناگوں سیاسی و مذہبی مسائل درپیش رہے۔ ان کا دور خلافت مختصر بھی تھا۔ لیکن انہوں نے قرآن مجید کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کیا'' (۱۶)۔ (یہ ایک رائے ہے، دیگر محققین کی رائے اس سے مختلف ہے۔ عہدِ صدیق میں فروغِ علم اپنے عروج پر تھا۔ کبارِ صحابہ نے اس عہد میں علم کی شمعیں جلا رکھی تھیں۔ مدیر)

''..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسرے خلیفے تھے۔ آپ رضہ نے مسجد میں ہی علمی فروغ کی حوصلہ افزائی کی۔ بچوں کے مدارس عموماً مسجد میں ہی ہوا کرتے تھے۔ ان حلقوں کی تعداد چار ہزار نو سو کے لگ بھگ تھی اور ان کا انتظام نو سو مساجد میں تھا۔'' (۱۷)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ نے بھی سابقہ تعلیمی پالیسی برقرار رکھی۔ اپنے دور حکومت میں قرآن کریم کی کتابت وقرات کے اختلافات کو دور کیا۔ قرآن مجید کی کئی کئی جلدیں مختلف مراکز میں رکھوا دیں تاکہ لوگ اپنے اختلاف دور کر سکیں۔ حضرت علیؓ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے بھی علم کے فروغ میں اپنا کردار ادا کیا اور تعلیمی مراکز مساجد میں قائم رہے۔

تعلیم کی اشاعت وتوسیع میں خلفائے راشدین کے دوش بدوش علماء وصحابہ کرام نے بھی بہت نمایاں علمی خدمات سرانجام دیں اور انہوں نے دور دراز کے علاقوں میں علم کو پھیلایا۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''عرب سے ہزاروں صحابہ وعلماء نئے مفتوحہ علاقوں اور ملکوں میں جا بسے اور وہیں پر رہنے لگے۔ ایک اندازے سے شام میں دس ہزار، کوفے میں ایک ہزار، حمص میں پانچ سو اور مصر میں ساڑھے تین سو صحابی موجود تھے۔'' (۱۸)

بنوامیہ کا دور:

''اموی خلفاء نے علم کو مزید فروغ دیا۔ امیر معاویہؓ کو تاریخ کے علم سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ اس مضمون میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ بڑے بڑے عالم ان کے رفقاء تھے۔ بنوامیہ کے حکیم خالد بن یزید نے طب اور کیمیا کے علوم پر کئی رسالے لکھے۔ خلیفہ عبدالملک نے سعید بن مسیّب سے قرآن حکیم کی تفسیر لکھوائی۔ ہشام بن عبدالملک نے فارسی کی کتب کا ترجمہ کروایا اور دیگر علمی خدمات کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اساتذہ کے مشاہرے اور طلبہ کے وظیفے مقرر کئے۔ انہوں نے فرمانوں کے ذریعے گورنروں کو ہدایت کی کہ وہ تعلیم کی اشاعت اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر کریں۔ ایک عامل کو حکم دیا اور لکھ کر بھیجا کہ طالب علموں کے وظیفے مقرر کرو تاکہ وہ فارغ البال ہو کر تحصیل علم میں مشغول ہو جائیں۔ حمص کے گورنر کو ہدایت فرمائی: ان لوگوں کا خیال رکھو جنہوں نے اپنے آپ کو علم کے فروغ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اور دنیا کے حرص وہوس کو چھوڑ کر اور دنیا کی مسرتوں

سے بے نیاز ہو کر مساجد میں قیام پذیر ہیں۔ان میں سے ہر ایک کا سو سو دینار مشاہرہ مقرر کر دیا جائے تا کہ ان کی کفالت ہو سکے۔قاضی ابوبکر بن حرم کے نام ایک خط لکھا کہ علم پھیلاؤ، علمی مجالس منعقد کرو تا کہ بے علم عالم بن جائیں۔اسی کے ساتھ ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا علمی کارنامہ علم حدیث کی تدوین بھی ہے۔''(۱۹)

اسی طرح فقہ حنفی کے بانی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (۸۰ھ۔۱۵۰ھ) کا علمی زمانہ بھی دور بنوامیہ سے تعلق رکھتا ہے۔اسی دور میں فقہ مالکیہ کے بانی امام مالک بن انسؒ ۹۳ ھجری میں پیدا ہوئے۔آپ کی مرتب کردہ کتاب الموطا آج بھی حدیث اور فقہ کی متداول کتاب ہے۔

عباسی دور:

عباسی دور حکومت میں تعلیم و تربیت، قرآن و سنت کی اشاعت اور مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علماء کی قدر دانی جاری رہی، جب کہ اس دور میں علم کی اشاعت و ترویج کے لیے حکمرانوں نے بھرپور اقدامات کیے۔ پروفیسر محمد فیروز شاہ لکھتے ہیں کہ:''عباسیوں کا دارالخلافہ بغداد تھا جو کہ بہت جلد ''عروس البلاد'' کے نام سے مشہور ہو گیا، نامور خلفاء منصور، ہارون الرشید اور مامون الرشید نے علم و حکمت کے موتیوں کو یہاں اکٹھا کیا۔ ہارون الرشید کے تہذیبی کارناموں کی شہرت یورپ میں بھی تھی۔اس کے زمانہ حکومت میں بغداد میں سب سے پہلا میڈیکل کالج قائم ہوا جس کے ساتھ ایک بڑا شفاخانہ بھی تھا۔ مامون الرشید نے بغداد کو سائنسی تحقیقات کا مرکز بنا دیا، زمانہ حال کے علماء کی نگاہ میں عباسیوں کا ناقابل فراموش علمی کارنامہ بغداد میں ''دارالحکمہ'' کا قیام ہے۔''(۲۰) اس کے ساتھ ساتھ امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا علمی زمانہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتا تھا۔امام شافعی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ علیہ سے علوم و فنون حاصل کیے اور پھر علوم دینیہ کے فروغ کے لیے درس دینا شروع کیا، آپ کی علمی کاوشوں سے بہت سے لوگ درجہ اجتہاد کو پہنچے جن میں حسن بن محمد زعفرانی بغدادی، امام احمد بن حنبل، یوسف بن یحییٰ وغیرہ شامل ہیں۔''(۲۱)

اندلس میں تعلیم کی ترقی:

اندلس میں تعلیم کی ترقی کی وجہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر غلام جیلانی مخدوم لکھتے ہیں:''اندلس میں علوم کے سلسلہ میں اتنا کہہ دینا چاہیے کہ ان میں ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ یہ تھا کہ کاغذ بہ کثرت بننے لگا تھا۔ وہاں بھی ہر علم کے بے شمار عالم پیدا ہوئے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی کتابیں بھی بہ کثرت اندلس پہنچیں۔اندلس ہی کے ذریعہ سے مشرقی علوم کے یہ ذخیرے یورپ پہنچے۔ یہاں تک کہ آج یورپی عالم بھی مانتے ہیں کہ اندلس کے جغرافیہ دان ہی زمین کے گول ہونے پر زور دیتے رہے۔انھیں کی کتابوں سے نئی دنیا کی دریافت کا راستہ کھلا۔''(۲۲)

اندلس کے تعلیمی اداروں اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم کے متعلق مزید لکھتے ہیں:''اشاعت تعلیم کے بارے میں قرطبہ یونیورسٹی کی خدمات بہت زیادہ تھیں۔اس یونیورسٹی کی بنیاد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھی تھی۔اور اس یونیورسٹی کی

تکمیل ہشام کے ہاتھوں ہوئی، اس یونیورسٹی میں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، ان کی فہرست ذیل ہے: ۱۔قرآن پاک، ۲۔حدیث شریف، ۳۔ جراحت اور طب، ۴۔ادویہ سازی، ۵۔نجوم وہیئت، ۶۔فلسفہ، ۷۔ ریاضی، ۸۔جغرافیہ وتاریخ، ۹۔ادب، ۱۰۔زراعت کے علاوہ صنعت وحرفت۔ ہرعلم کا شعبہ الگ تھا، فارغ ہونے والے طلبہ کو باقاعدہ سندات ملتی تھیں، یورپ نے اسی یونیورسٹی سے فیض حاصل کیا۔‘‘ (۲۳)

دورعثمانیہ:

تعلیم کے سلسلے میں ترک سلاطین کا زمانہ زیادہ شاندار ہے، ترکی مدارس کئی خصوصیات کے حامل ہیں، تمام مدارس ایک جامعہ یعنی یونیورسٹی سے منسلک ہوتے، مدرسین کے لیے پنشن کا طریقہ رائج ہوا۔ سلطان بایزید نے ۸۸۶ھ میں مدرسین کے علاوہ دیگر علماء کی تنخواہیں اور وظائف مقرر کیے۔ پروفیسر غلام جیلانی لکھتے ہیں: ’’سلاطین عثمانیہ کی ادبی اور علمی سرگرمیاں بلاشرکت غیرے اپنی مثال آپ تھیں۔عثمانی دور میں استنبول کا وہی مقام تھا جو سلطنت عباسیہ کے زمانے میں بغداد کا اور مصر میں قاہرہ اور اندلس یعنی سپین میں غرناطہ اور قرطبہ کا تھا۔‘‘ (۲۴)

برصغیر میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام:

برصغیر میں اسلام کی دعوت دور رسالت ﷺ اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر بنوامیہ کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے میں ہوگیا تھا اور سندھ کے پرانے لٹریچر اور ثقافت کے مطالعے سے اس کے نقوش آج بھی نظر آتے ہیں۔

’’مغل بادشاہ علم وتعلیم کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس ضمن میں بابر اور جہانگیر کی توزک (ذاتی سوانح عمریاں) بہترین مثالیں ہیں۔ جہانگیر کو علم وادب کا شاہزادہ کہا جاتا ہے۔ شاہ جہاں اور عالمگیر بھی علم وتعلیم کی سرپرستی کرنے میں پیش پیش تھے۔ اکبر کے زمانے میں فتح پورسیکری، تعلیم وتعلم کی عظیم درس گاہ شمار ہوتی تھی۔ آثار الصنادید کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں ایسی متعدد عمارتیں تھیں جو تعلیم کے لیے وقف تھیں ...اکبر کے زمانے میں فیضی اور ابوالفضل کی مثالیں ندرت کی حامل ہیں۔ فیضی نے قرآن پاک کی بے نقط تفسیر ’’سواطع الالہام‘‘ لکھی۔‘‘ (۲۵)

نامور دانشور پروفیسر خورشید احمد برصغیر میں تعلیمی نظام اور تعلم کے ارتقا کے حوالے سے لکھتے ہیں: ’’برصغیر میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی۔ پھر قدیم اسلامی روایات کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔ اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ کتب خانے اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے۔‘‘ (۲۶)

’’اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) برصغیر پاک وہند کا پہلا بادشاہ تھا جس نے تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اس نے تجرباتی طور پر گجرات کے بوہروں کے لیے تعلیم لازمی کردی۔ اس نے گجرات کے حاکم مکرمت خان کو

فرمان جاری کیا کہ اپنے صوبے میں ہر جگہ مدرسے قائم کریں۔ اس نے ان گنت نئے مدرسے قائم کیے۔اورنگ زیب کے عہد میں سیالکوٹ اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا جہاں ملک کے مختلف حصوں سے علما مولانا عبدالحکیم کے مدرسے میں حصول علم کے لیے آتے تھے۔اسی طرح لکھنو میں ایک بڑا مدرسہ فرنگی محل کے نام سے قائم ہوا جسے علامہ شبلی نعمانی ہندستان کا آکسفورڈ یا کیمبرج قرار دیتے تھے۔اس عہد کا ایک اور مشہور مدرسہ دہلی کا مدرسہ رحیمیہ تھا جسے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے قائم کیا تھا۔''(۲۷)

برطانوی استعماری عہد میں نظام تعلیم:

برصغیر میں تعلیم کی ترقی اور ترویج کے حوالے سے ایک اور اہم دور جس کی نشاندہی یہاں ضروری محسوس ہوتی ہے، وہ ہے انگریزوں یا استعمار کا دور۔اس دور میں پہلے سے موجود نظام تعلیم کی جگہ ایک نیا نظام تعلیم تشکیل دے کر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے مسلط کیا گیا۔اس دور کی منظر کشی کرتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:''ہندستان میں انگریز پہلے پہل معالجوں اور تاجروں کے روپ میں آئے اور بالاخر اس ملک کے حکمران بن گئے۔''ایسٹ انڈیا کمپنی''۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی۔اس کمپنی کا مقصد تجارت تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک سیاسی حیثیت بھی تھی۔آہستہ آہستہ اس کا سیاسی پہلو زیادہ حاوی ہوتا گیا اور ۱۷۵۷ء کی ''جنگ پلاسی'' میں فتح کے بعد یہ ایک حکمران قوت کی حیثیت سے ابھری۔ ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایک سرکاری فرمان کے ذریعے انگریزوں کے حوالے کردی تھی۔ یہاں سے انگریزوں کی تعلیمی اور سیاسی حکمت علمی کا آغاز ہوتا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ۱۸۵۷ء تک رہا، جب کہ ملکہ وکٹوریہ نے پورے اختیارات براہ راست خود سنبھال لیے۔اور پھر برطانوی حکومت ۱۹۴۷ء تک حکمران رہی۔''(۲۸)

انگریزوں کے دور حکومت کو تعلیمی اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (الف) پہلا دور ۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء، (ب) دوسرا دور ۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۴ء، (ج) تیسرا دور ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۵ء، (د) چوتھا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء۔

پہلا دور (۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء): اس دور میں انگریزوں نے ایک ایکٹ تعلیمی ترقی کے لیے بنایا جسے ۱۸۱۳ کا چارٹر ایکٹ کہتے ہیں، اس میں تعلیمی ترقی کے لیے جو دفعات ہیں وہ یہ ہیں:

i) تعلیم کمپنی کی ذمہ داری ہوگی اور اسے اپنے وسائل میں سے ایک لاکھ روپے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص کرنے ہوں گے۔

ii) تعلیم کے لیے مختص شدہ رقم باقاعدہ سالانہ بجٹ کے ذریعے مغربی علوم وسائنس کی اشاعت اور مشرقی علوم (سنسکرت، عربی) کے احیاء نیز مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

iii) تعلیم کا اولین مقصد اہل ہند تک عیسائیت کا پیغام پہنچانا ہوگا اور اس کے لیے مشنری اداروں کو نہ صرف کھلی اجازت ہوگی بلکہ ان کی ہر طرح سرپرستی کی جائے گی۔

iv) مغربی علوم وسائنس کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے دی جائے گی۔

۱۸۱۳ء کا چارٹرا یکٹ ہندستان میں انگریزی نظام تعلیم کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے بعد جو بھی ارتقا ہوا اس کے دیے ہوئے خطوط پر ہوا،اس ایکٹ کی رو سے مشنری تعلیم کو قانونی تحفظ فراہم کردیا گیا اور یہ بات ہمیشہ کے لیے طے پاگئی کہ ہندستان میں تعلیم کا مقصد مغربی علوم اور انگریزی زبان کے ذریعے اہل ہند کو عیسائیت کی طرف لے جانا ہے۔اس مقصد کو آہستہ آہستہ اور پوری خاموشی کے ساتھ مقامی نظام تعلیم کو نیست ونابود کرکے حاصل کیا جائے گا۔'' (۲۹)

دوسرا دور(۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۴ء): ۱۸۱۳ کے چارٹر کی رو سے مختص ایک لاکھ روپیہ میں سے دس سال تک کمپنی تعلیم پر کچھ خرچ نہ کرسکی، کیوں کہ کمپنی کے عہدے داروں میں مستشرقین کا گروہ اس بات پر بضد تھا کہ اس رقم کو مشرقی علوم (عربی، فارسی، سنسکرت) کی ترویج واشاعت پر صرف کیا جائے،اس کے مقابلے میں مستغربین کا گروہ اس بات پر مصر تھا کہ یہ رقم مغربی علوم و سائنس کی تعلیم پر خرچ کی جائے۔۱۸۲۳ء میں یہ رقم مشرقی علوم کی تعلیم پر صرف کی جائے۔جس کے نتیجے میں آگرہ اور دہلی میں کالج کھولے گئے،ان کالجوں میں ذریعہ تعلیم اردو تھا اور عربی فارسی کی تعلیم لازمی تھی۔۱۸۳۳ء میں اس رقم کو بڑھا کر دس لاکھ روپے سالانہ کردیا گیا۔لارڈ میکالے نے مستشرقین کی ڈٹ کر مخالفت کی۔۱۸۱۳ ایکٹ کی رو سے مشرقی علوم اور علما کر سرپرستی کے لیے جو مالی امدادی جارہی تھی اسے بند کردینے کی سفارش کی اور بالکل صاف الفاظ میں اس مقصد تعلیم کا اظہار کیا کہ ہمیں ایسی نسل تیار کرنا ہے جو ہمارے افکار ونظریات کی ترجمان ہو اور جو رنگ ونسل کے اعتبار سے بے شک ہندی ہو لیکن فکرونظر اور سیرت واخلاق کے اعتبار سے خالص انگریزی ہو،میکالے کی ان سفارشات کی روشنی میں تعلیمی پالیسی کا جو علانیہ تیار ہوا اسے Bantick Resolution کہتے ہیں جو ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو منظور کیا گیا،اس ریزولیشن کے اہم خدوخال یہ ہیں:

i) سرکاری تعلیم کا مقصد ہندستان میں مغربی علم وسائنس کا فروغ ہے۔

ii) آیندہ ملک کی سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہوگی۔

iii) ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔

iv) مشرقی علوم کی اشاعت پر آیندہ سے کوئی رقم خرچ نہیں کی جائے گی۔(۳۰)

تیسرا دور(۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۵ء): تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کا زمانہ ہے۔اس کے اہم خدوخال یہ ہیں:

i) ہر صوبے میں ڈی پی آئی کی سربراہی میں تعلیم کا محکمہ قائم کیا جائے گا۔

ii) لندن یونیورسٹی کی طرز پر ملک میں یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی، ۱۸۵۷ء میں بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، پنجاب یونیورسٹی ۱۸۸۷ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔(۳۱)

چوتھا دور(۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء): تعلیمی نقطہ نظر سے اس دور کا آغاز لارڈ کرزن کی سخت گیر تعلیمی پالیسی سے ہوتا ہے۔لارڈ کرزن نے اپنی تقریروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے متعلق ایسے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے جو قومی

غیرت کے لیے تازیانہ ثابت ہوئے اور قومی تعلیم کا رجحان پیدا کرنے کا سبب بنے۔ ۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے مسائل کی چھان بین کے لیے سیڈلر (Saddlar) کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ کمیشن نے پورے برصغیر کے تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیں:

i) سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم پر یونیورسٹیوں کا کنٹرول ختم کر کے اسے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی تحویل میں دیا جائے۔

ii) یونیورسٹی میں داخلے انٹرمیڈیٹ کی بنیاد پر ہوں۔

iii) ڈگری کورس کی مدت تین سال کر دی جائے۔

iv) یونیورسٹیاں پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔

v) سیکنڈری سطح پر علاقائی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔

vi) انگریزی صرف یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کی جائے۔

vii) یونیورسٹی کا کام صرف امتحانات لینا ہی نہ ہو بلکہ وہ تدریسی کام بھی کریں۔(۳۲)

برصغیر میں استعمار کے نظام ہائے تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ دوسرے تعلیمی نظام بھی نظر آتے ہیں، جن کا دائرہ کار مختلف طبقات اور بالخصوص مسلمانوں کے شاندار ماضی کی تعلیمی خدمات کے باعث سامنے آیا۔ اس تعلیمی نظام کی خوبی یہ تھی کہ اس کے تحت قائم کیے گئے تعلیمی اداروں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی استعداد بڑھائی جائے تاکہ غلامی اور استعمار کی چالبازیوں سے قوم کو بیدار کیا جا سکے۔ لہٰذا اس فلسفے کے تحت قائم اداروں نے اپنے اپنے میدانوں میں جو خدمات سرانجام دیں وہ قابل تحسین ہیں۔ ان اداروں میں دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نمایاں ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات

برصغیر میں استعمار کی آمد کے بعد اس وقت کے جید علماء کرام، نامور دانشوروں نے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے اور استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھوس نظام ہائے تعلیم رائج کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو خواندہ کرنے کے لیے مختلف مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں نے اس دور میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ یہی وجہ ہے ان جامعات سے نکلنے والے سیکڑوں لوگوں نے آزادی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں چار رجحان زیادہ نظر آئے:

i) پہلا رجحان نئے تعلیمی نظام سے کلی انقطاع اور پرانے تعلیمی نظام کے تحفظ کی کوشش۔ اس کا نمائندہ ہے، دارالعلوم دیوبند۔

ii) دوسرا رجحان نئی تعلیم کو بحیثیت نظام کے تقریباً پورے طور پر قبول کر لینا اور جزوی ترمیمات کے ساتھ اسے مسلمانوں میں فروغ دینا۔اس رجحان کا نمایندہ ہے محمڈن اینگلواورینٹل کالج علی گڑھ۔

iii) تیسرا رجحان علی گڑھ اور دیوبند سے عدم اطمینان کی پیداوار ہے اور اس کی نمایندگی ''ندوۃ العلماء'' لکھنو کرتا ہے۔

iv) چوتھا رجحان ان تینوں تحریکات کو بدلتی ہوئی قومی اور ملی ضروریات پورا کرنے میں ناکافی محسوس کرتے ہوئے تعلیم کو قومی رنگ میں رنگنے کا تھا، جو پہلی عالمی جنگ کے بعد رونما ہوا۔اس کا نمائندہ 'جامعہ ملیہ دہلی' ہے۔'' (۳۳)

دارالعلوم دیوبند:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰۳۔۶۲ ۱۷ء) پاک و ہند میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔مسلم حکومت کے آخری دور کا یہ مجدد زندگی کے ہر میدان میں اسلام کے احیا و اثبات کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ان کی تجدیدی کوششوں کا اہم حصہ سید احمد شہید رحہ کی تحریک مجاہدین تھی۔علماء ہند نے ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں شرکت کی، لیکن بدقسمتی سے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکی۔اس تحریک کے باقی ماندہ چند لوگوں نے کام کا ایک دوسرا لائحہ عمل بنایا اور وہ یہ تھا کہ تعلیم کے ذریعے اسلامی علوم اور ثقافت کو محفوظ کر لیا جائے۔دارالعلوم دیوبند انھی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مولانا محمود الحسن مرحوم اس مدرسے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ''جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا۔کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔'' ...... دیوبند کا مدرسہ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں قائم ہوا جو مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اس مدرسے کے پہلے سربراہ تھے۔۱۸۶۷ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم میں تبدیل ہوگیا۔شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اس کے پہلے طالب علم تھے۔(۳۴)

دارالعلوم کا مقصد:

مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے دارالعلوم قائم کر کے یہ نعرہ بلند کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔اس کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جذبہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہوگیا جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک وتر کو بہالے جائے گا، بلکہ اگر اس زور کا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں جو اسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔(۳۵)

دارالعلوم دیوبند کی قابل ذکر خصوصیات

الف: اس ادارے کا اصل مقصد دینی تعلیم کے ایک مرکز کا قیام تھا۔ پیش نظر یہ تھا کہ اس وقت جب کہ پورے ہندستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کی حیثیت ایک مدرسے کی نہیں، ایک تحریک کی تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ ایسا ہی ہوا۔

آخری دور میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں تین نمایاں روایتیں ملتی ہیں۔ ایک دہلی کی جس میں شاہ ولی اللہؒ کے زیر اثر قرآن وحدیث کی تعلیم کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ دوسری فرنگی محل کی، جو درس نظامی کا اصل گہوارہ تھا اور جہاں فقہ واصول اور معقولات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور تیسری خیرآبادی کی جہاں کلام کو غلبہ حاصل تھا۔ دیوبند میں نظام تعلیم کی بنیاد درس نظامیہ کو بنایا گیا۔ لیکن اولین دور میں اس کا مزاج دہلی کی روایت سے قریب تر تھا۔ بعد میں فقہ اور کلام دونوں کی طرف رجحان بڑھا اور ایک حیثیت سے یہ مدرسہ تینوں روایتوں کا جامع ہو گیا۔ یہاں کا تعلیمی کورس ۹ سال کا تھا۔

ب: دیوبند کے پورے نظام تعلیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اصل مقصد دینی تعلیم کا تحفظ ہی تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ذہنی وسعت اور پیشہ ورانہ آزادی پیدا کرنے کے لیے چند دوسری چیزوں کو بھی تعلیم کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ مثلاً علم طب کو ایک ضمنی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کیا گیا۔ اس کے علاوہ خطاطی کو ایک مضمون بنایا گیا، نیز مختلف گھریلو حرفتوں کی ابتدائی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا۔

ج: دیوبند کی نہایت اہم خصوصیت اس کی آزادی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحہ نے دیوبند کے لیے جو اصول مرتب کیے تھے، ان میں یہ اصول بھی تھا کہ ہم دینی پہلو کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ضمیر کی آزادی اور حکومت اور امراء کی گرفت سے اسلامی تعلیمی ادارے کو آزاد رکھنے پر دیتے ہیں۔ (۳۶)

دارالعلوم دیوبند کا قیام علمی سرمایہ کا تحفظ

دارالعلوم دیوبند کی قابل ذکر خصوصیات کے ساتھ ہمیں اس بات کو بھی سامنے رکھنا ہوگا کہ ادارہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اسلاف کا علمی سرمایہ آیندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا موجب بنا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے دور میں یہاں کے فارغ ہونے والے طالب علموں نے علمی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

پروفیسر سید محمد سلیمؒ رقمطراز ہیں کہ: ''برطانوی حکومت کی مسلم کش پالیسی کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ صدیوں سے غالب اور کارفرما مسلمان قوم کو ایک صدی کے اندر شاہراہ حیات سے اٹھا کر دور پھینک دیا گیا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے تقریباً سات ہزار علما کو تہہ تیغ کیا۔ قوم کی سربراہی کمتر درجہ کے لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ملک میں جو نظام تعلیم رائج کیا گیا تھا وہ سراسر مادی تھا۔ اسلامی دور کی تدریسی سہولتیں بھی سب ختم کر دی گئیں تھیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی نوخیز نسلیں جہالت اور بے دینی کا شکار بنتی چلی جا رہی تھیں۔ قومی اور ملی شعور سے بیگانہ ہو رہی تھیں۔

تعلیم مسلمانوں کے لیے دینی فریضہ ہے۔ جنگ آزادی کی قیامت خیز آندھی فرو ہو جانے کے بعد سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ملت کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔اس گروہ میں دو نقطہ نظر کے حامل افراد پائے جاتے تھے۔اہل علم کے ایک بڑے طبقے کا خیال یہ تھا کہ حکومت وقت کی معاندانہ کارروائیوں کے پیش نظر اس سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کیا جائے اور نوخیز نسلوں کی اسلامی تربیت کے کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔اس کے لیے قدیم طرز کے مدارس قائم کیے جائیں۔علما کا تسلسل باقی رہے جو مسلمان معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ جو دینی تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کرتا تھا، مگر ساتھ ہی ملک کے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا بھی خواہشمند تھا۔اس نے مغربی علوم میں اسلامی دینیات کی پیوندکاری کا طریقہ اختیار کیا، جس کی مثال دارالعلوم علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ہیں، کبھی جدید عربی و دینی نصاب کے ساتھ انگریزی زبان کو شامل کیا، جس کی مثال دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو ہے۔کبھی دینی اور دنیوی علوم کا جدید آمیزہ تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔جس کی مثال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ ہے۔...... پہلے نقطہ نظر کے حامل علما کے سرخیل مولانا عنایت احمد کاکوروی تھے۔انھوں نے انڈمان کی قید سے رہائی کے فوراً بعد ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں نوآباد شہر کانپور میں سب سے پہلے ایک مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔لیکن اس مکتب کے مشہور عوام نمائندے مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۹ء) ہیں۔انھوں نے ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو ضلع سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبے دیوبند میں ایک مدرسہ کا افتتاح کیا۔حکومت وقت سے لاتعلقی اس مدرسہ کا بنیادی اصول قرار پایا۔''(۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اس مدرسہ کو مدرس ایسے ملے جو عالم متبحر، متقی اور مخلص تھے۔جنھوں نے اخلاص، یک سوئی اور لگن کے ساتھ تدریس کے فرائض انجام دیے۔یہاں سے فارغ ہو کر علماء ملک میں ہر طرف پھیل گئے۔انھوں نے مسلمانوں کی دینی خدمات انجادیں۔غیر ممالک سے بھی ہزارہا طلبہ یہاں آنے لگے۔وسعت اور اثرات کے لحاظ سے یہ اسلامی ہند کا عظیم الشان مدرسہ ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی:

سرسید احمد خان (۱۸۱۷ـ۱۸۹۸) مرحوم کے مسلمانوں پر احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان جو انھوں نے کیا وہ ایسا علمی و تربیتی ادارے کا قیام تھا جس سے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر اور شعور پیدا کرنے میں مدد ملی۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق: ''علی گڑھ یونیورسٹی ہندو پاکستان کے مسلمانوں کا سب سے اہم تعلیمی مرکز رہی ہے۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید احمد خان نے مغربی علوم کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا، جس نے ترقی پا کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کی۔۱۹۲۰ء میں یہ ادارہ ایک یونیورسٹی بن گیا جس کا نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی رکھا گیا۔یہ ایک اقامتی یونیورسٹی ہے، جسے اوکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر بنایا گیا ہے۔اس میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام ہے۔ اس کے زیر نگرانی دو ہائی اسکول اور ایک لڑکیوں کا لج ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آرٹ اور سائنس کے تمام ضروری

ادارے، طبیہ کالج، ٹریننگ کالج، انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج قائم ہیں۔ تقسیم برصغیر کے بعد یونیورسٹی کے دستور میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے یونیورسٹی کی آزاد اسلامی حیثیت متاثر ہوئی ہے اور حکومت کا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور اس میں غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ گئی ہے۔'' (۳۸)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے شیخ محمد اکرم مزید لکھتے ہیں: ''سرسید ۱۸۷۰ء میں ولایت سے واپس آئے۔ واپسی پر انھوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے۔ چنانچہ محمڈن کالج فنڈ کمیٹی قائم ہوئی۔ حکومت ہند نے جسے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تھی، اس تجویز کو بہت پسند کیا اور لکھا کہ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تجویز اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت اس میں مدد دے۔ اخلاقی امداد اور امدادی گرانٹ کے وعدے کے علاوہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ سرولیم میور نے ایک ہزار دیا اور دوسرے انگریز افسروں نے بھی مدد کی۔ بالآخر فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مجوزہ کالج کے متعلق مکمل اسکیم پیش کی، جسے کمیٹی نے منظور کیا۔ اس کے بعد یہ قرار پایا کہ علی گڑھ میں جہاں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا، پہلے ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ سرسید اس زمانے میں بنارس میں تھے۔ اس اسکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سکریٹری علی گڑھ سب کمیٹی کو کرنا پڑا۔ انھوں نے یہ کام دلچسپی اور کوشش سے سرانجام دیا۔ (۳۹)

علی گڑھ کالج کے قیام کے حوالے سے مولانا حالی رقمطراز ہیں کہ: ''سرسید نے کالج کے قیام سے قبل مختلف لوگوں کے موصول شدہ مضامین میں سے ایک عمدہ رپورٹ اردو اور انگریزی میں تیار کی، جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کر کے ان سے مفصلہ ذیل نتائج استخراج کیے تھے:

i) ہندستان کے سمجھدار مسلمان ان تعصّبات کو جو پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر جانتے ہیں۔

ii) مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بہ مقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔

iii) جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے، ان میں سے کچھ ناواجب اور اکثر واجبی ہیں۔ اور سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے۔

iv) اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقہ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تو بھی ان کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں۔

v) مسلمانوں کو اپنے علوم قدیم کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کی فکر آپ خود کریں۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقہ تعلیم بھی مندرج تھا جو سرسید نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔'' (۴۰)

مولانا حالی مزید لکھتے ہیں: ’’سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اس وقت مسلمانوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ ’’اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی‘‘ ان میں صدہا باتیں اصلاح طلب اور ان کے متعلق صدہا مشکلات حل طلب تھیں۔انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اس بات میں دیکھی کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔‘‘ (۴۱)

علی گڑھ تحریک کی بنیادی حیثیت تعلیمی تھی۔اس لیے ناگزیر تھا کہ یہاں سے ماہرین تعلیم اٹھیں اور ملک میں تعلیم کا چرچا کریں۔دور سرسید کی پیداوار میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر بشیر الدین، مولوی طفیل احمد منگلوری (۱۸۶۸ تا ۱۹۴۶ء)، سرراس مسعود (م ۱۹۳۷ء)، مولوی فرید احمد نظامی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔دوسری طرف کتاب ’’علی گڑھ کی علمی خدمات‘‘ کے مطابق: ’’بعد کے دور میں علی گڑھ نے جو مشہور ماہرین تعلیم پیدا کیے ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ء)، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر حبیب الرحمٰن، ضیاء الحسن علوی، سید اسد اللہ کاظمی کی خدمات اور کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے۔‘‘ (۴۲)

سرسید احمد خان کی مخالفت

علی گڑھ کالج کے قیام کے حوالے سے سرسید احمد خان کو مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، علی گڑھ تحریک اگر چہ بظاہر تعلیمی تھی، لیکن چونکہ سرسید کے نزدیک اس زمانے کے حالات کے تحت، مسلمانان ہند کی بیداری کے سب وسائل تعلیم پر منحصر اور تعلیم ہی کے توسط سے ممکن تھے، اس لیے تعلیم کے پہلو بہ پہلو سیاسی، دینی اور ادبی شعبہ ہائے زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے۔بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے خاص طرز حیات اور خاص انداز فکر نمودار ہوا۔اسی حوالے سے نامور اسکالر شیخ محمد اکرم کہتے ہیں:

’’کالج کے قیام میں سرسید کو تمام روشن خیال اور بااثر مسلمانوں کی مدد حاصل تھی، لیکن ایک طبقے میں چند وجوہ کی بنا پر ان کی بہت مخالفت ہوئی اور چونکہ اس مخالفت کے متعلق عوام بلکہ خواص میں بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں۔اس بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی بہت عام ہے کہ علما نے سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔تحصیل علم کے بارے میں رسول کریم کا واضح ارشاد ہے: **اطلبوا العلم ولو کان بالصین** (۴۳) (محدثین نے اِس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔بہرحال اسلام کی عمومی تعلیم یہی ہے کہ علم اور خیر بات جہاں سے ملے، اُسے لے لیا جائے۔حکمت کو مومن کا گمشدہ مال کہا گیا ہے۔مدیر) یعنی علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین میں جانا پڑے۔اس کے علاوہ جب شاہ عبدالعزیز سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتویٰ لیا گیا تھا تو انھوں نے کہا ’’جاؤ۔انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔شرعاً ہر طرح جائز ہے۔‘‘ اب لوگ حیران ہیں کہ جب سرکار کے قائم کیے ہوئے کالجوں میں پڑھنا جائز تھا تو ایک ایسے مدرستہ العلوم کی کیوں مخالفت ہوئی جو مسلمانوں کا جاری کردہ تھا۔‘‘ (۴۴)

پروفیسر سید محمد سلیمؒ اپنی کتاب ’’ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت‘‘ میں علی گڑھ تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ’’...... تقویٰ، دینداری، حق پرستی اور استقامت مسلمان معاشرہ کی معروف اقدار ہیں۔سرسید کی تعلیمات

کے زیر اثر نئی اقدار کو فروغ حاصل ہوا۔ابن الوقتی،خوشامد اور نفاق کو کسی نہ کسی انداز میں محمود بنا کر پیش کیا گیا۔مسلمانوں کو بتایا گیا کہ زمانہ کا ساتھ دو،اپنے اخلاق و کردار کو وقت کے سانچے میں ڈھال لو۔''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' یہ انقلاب عادات واطوار،ذہنیت اور مزاج اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کم از کم اسلامی اقدار اور اسلامی ثقافت سے آدمی بے تعلق نہ ہو جائے۔ایک بڑی تبدیلی مسلمانوں کے تصور تعلیم میں آ گئی۔اب تک مسلمان علوم وحی کو ہی اصل علم سمجھتے تھے، عربی زبان اور قرآن وحدیث کے عالم کو ہی جانتے تھے۔دار العلوم علی گڑھ کے اثرات عام ہو جانے کے بعد دنیوی علوم کی تعلیم کو ہی کافی اور وافی سمجھا جانے لگا اور علم دین کے جاننے کی ضرورت کا احساس مضمحل ہوتا چلا گیا۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی گڑھ مسلمانوں کی شاندار روایات سے اور ہزار سالہ اقدار حیات سے کٹ گیا۔مدرسہ عالیہ کلکتہ تو بہر نوع مسلمانوں کی تعلیمی روایات سے وابستہ رہا،لیکن سرسید احمد خان دہلوی کا قائم کردہ اینگلو محمڈن کالج ہندستان کی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے بھی کیمبرج اور ایٹن کا چربہ بن گیا۔انگریزوں کی مزاحمت اب خود بخود ختم ہوگئی۔بلکہ ظالم اور قاتل محسن نظر آنے لگے۔بقول اکبر:''دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے''۔آخری عمر میں سرسید کو نئی نسل کی بے راہ روی دیکھ کر جدید تعلیم کی بعض خرابیوں کا احساس ہوا۔وہ اس پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔''(۴۵)

علی گڑھ تحریک نے جہاں برصغیر میں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم اور بالعموم مغربی علوم اور بالخصوص انگریزی تعلیم کے دروازے کھول دیے،گو کہ مختلف اہل علم ودانش کی طرف سے اس تعلیمی نظام کی شدید مخالفت بھی کی گئی۔سرسید احمد خان کے کارناموں کے حوالے سے پروفیسر سید محمد سلیمؒ رقمطراز ہیں:

i) سرسید نے''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر ہنگامہ کے اصل اسباب پر سے نقاب کشائی کی،اور کسی قدر مسلمانوں کی جانب سے صفائی پیش کی گئی،تا کہ انگریزوں کا رویہ نرم ہو،حالاں کہ ان کے دوست واحباب اس دکھتی رگ پر قلم اٹھانے سے منع کرتے رہے۔یہ ان کا جرأت مندانہ اور قابل قدر کارنامہ ہے۔

ii) پھر انھوں نے لائل محمڈنز آف انڈیا''ہندستان کے وفادار مسلمان'' نامی رسالہ جاری کیا۔اس میں انھوں نے ان مسلمانوں کو حالات تفصیل سے بیان کیے،جنھوں نے غدر کے ہنگامہ میں جان پر کھیل کر بھی انگریزوں کی جان بچائی تھی۔اس کے مطالعہ سے انگریزوں کے انداز فکر میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہوئی۔قدرے نرم گوشہ تیار ہوا۔

iii) مسلمان انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔انگریز اس لفظ کو اپنے لیے گالی تصور کرتے تھے۔سرسید نے ایک رسالہ''حقیقت لفظ نصاریٰ'' لکھا اور اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا اور بتایا کہ اس لفظ میں کسی طرح ذم کا پہلو نہیں ہے۔

iv) سر ولیم ہنٹر (۱۸۴۰۔۱۹۰۰ء) نے ۱۸۷۰ء میں ایک کتاب لکھی''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' اس کتاب میں اس نے ثابت کیا کہ مسلمان عموماً اور وہابی خصوصاً حکومت برطانیہ سے بغاوت کرنے پر مامور ہیں۔سرسید نے اس کے خلاف کتاب لکھی:''ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو'' (مختصراً ہنٹر پر ہنٹر)۔اور ثابت کیا کہ عام مسلمان

ہوں یا وہابی، وہ بھی اسی طرح وفادار ہیں جس طرح دوسرے لوگ۔‘‘(۴۶)

ندوۃ العلماء، لکھنو:

حقیقت یہ ہے کہ ندوۃ العلماء لکھنو جدید دور کی دینی درس گاہ تھی۔اس ادارے کو قائم کرنے والے حضرات وقت کے تقاضوں کو بھی تسلیم کرتے تھے اور قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح کے بھی قائل تھے۔اسی فکر کے اہم نمائندے مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) تھے۔وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

’’ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔‘‘(۴۷)

اسی حوالے سے پروفیسر سید محمد سلیمؒ لکھتے ہیں کہ:’’مدرسہ الٰہیات کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر۱۸۹۲ء بمطابق ۱۳۱۰ھ میں علماء کی ایک تنظیم بنام ندوۃ العلماء قائم ہوئی۔اشاعت اسلام اور قیام مدارس اس تنظیم کے اہم مقاصد تھے۔اس کے صدر مولانا محمد علی مونگیری خلیفہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (۳۱۳ھ۔۱۸۹۵ء) تھے۔مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا شبلی نعمانی (۱۳۳۳۔۱۹۱۴) و دیگر علماء اس کے ممبر تھے۔اس تنظیم کا اہم کارنامہ مدرسۃ ندوۃ العلماء لکھنو ہے۔‘‘(۴۸)

سید محمد سلیمؒ صاحب مزید لکھتے ہیں:’’اس تنظیم کا پہلا اجلاس ۱۷۔۱۵ شوال ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۸۹۳ء بمقام کانپور منعقد ہوا۔مدرسہ کے قیام پر تو آغاز ہی میں آسانی سے فیصلہ ہو گیا تھا، لیکن نصاب تعلیم کی کشمکش میں پانچ طویل سال صرف ہو گئے۔تنظیم ندوۃ العلماء نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک نیا نصاب تعلیم پیش کیا۔اس میں تفسیر و حدیث کو مناسب مقام دیا گیا۔جدید اسلوب کے مطابق نئی کتب تحریر کرائی گئیں۔عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح دی جانے لگی۔جدید علوم اور انگریزی علوم کا بھی انتظام کیا گیا۔اس طرح قدیم نصاب کی اصلاح کا دروازہ کھل گیا۔مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ کی درس گاہ ترک کر کے ندوۃ میں آ گئے۔ان کے زمانے میں درس گاہ نے بہت ترقی کی۔‘‘(۴۹)

جامعہ ملیہ اسلامیہ:

پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ندوۃ ہے تو نئی تعلیم میں پرانی تعلیم کی کچھ خصوصیات کو زندہ کرنے کی سعی، جامعہ ملیہ ہے۔خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۶ء) نے قومی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا۔ چنانچہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے کی کوشش شروع ہوئی۔مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ گئے، بہت سے طلبہ ان کے ہم خیال تھے لیکن کالج انتظامیہ نے گورنمنٹ سے قطع تعلق سے انکار کر دیا۔جو طلبہ محمد علی جوہر کی حمایت میں کالج سے علیحدہ ہوئے تھے، انھیں لے کر انھوں نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا جو ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔

پروفیسر سید محمد سلیمؒ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے پس منظر کے حوالے سے لکھتے ہیں:’’تحریک خلافت (۱۳۴۵۔۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۶۔۱۹۱۹ء) کے ہنگامہ خیز دور میں علی گڑھ یونیورسٹی کی روایتی انگریز دوستی میں بھی ہیجان برپا

ہوگیا۔انتظامیہ نے طلبہ کے جذبات کے برخلاف انگریز دوستی کی سابقہ روش برقرار رکھی۔ناراض ہوکر باغی طلبہ نے مقابلہ پر علیحدہ دینی جامعہ قائم کرلی۔شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کو جامعہ کا افتتاح کرنے کی دعوت دی، جو حال ہی میں مالٹا کی قید سے رہا ہوکر ہندوستان آئے تھے۔۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ کو شیخ الہند نے علی گڑھ کی جامعہ مسجد میں ''جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ'' کا افتتاح کیا۔خواجہ عبدالمجید بی۔اے کیمبرج کو جامعہ کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔''(۵۰)

پروفیسر صاحب مزید لکھتے ہیں: ''مولانا محمد علی جوہر نے جو کتابچہ تعارف تالیف کیا تھا، اس میں اس جامعہ کا مقصد یہ مقرر کیا گیا: ''ہمارا مطمع نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانہ حال، تعلیم وتربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں، بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں، جن میں اسلام کی روح ہو، اور جو اپنے مذہب سے اس قدر کافی بہرہ یاب ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں، دوسروں کی امداد سے مستغنیٰ اور بے نیاز ہوکر، خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔اس مقصد کے لیے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیا قرار دیا ہے۔''

سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس نصاب تعلیم کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ: ''اس طرح پہلی مرتبہ علم دین و دنیا ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوں گے۔جس سے بلاشبہ دونوں منفعت پذیر ہوں گے''۔(۵۱)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں اس جامعہ کے قیام کی جو خصوصیات نظر آتی ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

i) جامعہ ملیہ نے لادینی (Secular) تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا۔قرآن پاک اور سیرت نبوی کے مطالعے کو جزوی نصاب بنایا گیا۔عربی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔اردو کو انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔مصارف تعلیم بہت ہی کم رکھے گئے۔

ii) جامعہ کی امتیازی خصوصیت اساتذہ کا ایثار وقربانی ہے۔اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے اساتذہ نے نہایت معمولی مشاہروں پر خدمات انجام دیں۔نہایت سادہ زندگی بسر کی، اس طرح نہ صرف مسلمان اساتذہ کی روایت کو قائم کیا بلکہ اپنے طلبہ کے لیے بھی سادگی اور کفایت شعاری کا عملی نمونہ پیش کیا۔

iii) جامعہ کی ایک اور اہم خصوصیت صنعت وحرفت کی تعلیم ہے۔جامعہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا واحد ادارہ ہے جس نے سرکاری ملازمت کو اپنے طلبہ کا نصب العین نہیں بنایا۔

iv) جامعہ کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہاں کی علمی زندگی ہے۔جامعہ کی اردو اکیڈمی نے قابل قدر کتابیں شایع کی ہیں۔تعلیمی ریسرچ میں جامعہ کے اساتذہ نے بڑا کام کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جامعہ مختلف شعبوں سے ایک کامیاب تجربہ رہا۔لیکن یہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر اپنے اثرات مرتب نہ کرسکا۔

برصغیر کے تعلیمی اداروں کا ایک اجمالی جائزہ:

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے عقائد وافکار، معاشرت وتمدن اور اسلامی علوم وفنون کی حفاظت کی، بلکہ انھوں نے تحریک آزدی ہند اور تحریک پاکستان کے لیے نظریاتی کارکنوں اور رہنماؤں کی کھیپ بھی مہیا کی۔

فی الحقیقت دیوبند ہو یا علی گڑھ، دونوں کا نصاب تعلیم دور غلامی کے تقاضوں اور اس وقت کے مخصوص حالات اور پس منظر کا عکاس ہے۔ دونوں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب انگریز کا مکمل غلبہ ورعب قائم ہوا، اس کے عزائم برصغیر کو ایک عیسائی مملکت بنانے کے تھے۔ اس سے بجا طور پر اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ رفتہ رفتہ ہندوستان ایک اور اسپین نہ بن جائے جہاں کوئی کلمہ پڑھنے والا میسر نہ ہو۔ اس پس منظر میں حالات کا اولین تقاضا یہی تھا کہ جس قدر بھی دین اور علم دین اسلامی تہذیب وتمدن بچایا جاسکے، اس کے تحفظ کی بھرپور کوشش کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج برصغیر میں جو دینی علوم کے چرچے اور اسلام کی عملی وابستگی باقی ہے، وہ انھی قدیم تعلیمی اداروں اور بزرگوں کی اس حکمت عملی کا طفیل ہے۔

ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ اس دور میں مسلمانوں میں متوازی نظام ہائے تعلیم رواج پذیر ہوئے۔ ایک نظام تعلیم انگریزوں کا مسلط کردہ تھا جس کا مقصد ادنیٰ ملازمین کی ایک کھیپ تیار کرنا تھا تاکہ برطانوی سامراج کے مقاصد پورے ہوتے رہیں نیز مغربی علوم اور تہذیب کی ترویج ہوسکے۔ دوسرا مسلمانوں کا قومی تعلیمی نظام تھا جس میں دو متضاد مکتبہ فکر زیادہ نمایاں تھے، ایک کا نمائندہ دیوبند تھا اور دوسرے کا علی گڑھ۔ ان اداروں کے صرف لائحہ عمل ہی الگ الگ نہ تھے بلکہ ان کے طلبہ کی اقدار (Values) زندگی کے متعلقہ نقطہ نظر اور سوچ کا انداز بھی جدا جدا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ زندگی کے مسائل کے متعلق ان کی سوچ اور نقطہ نظر میں بنیادی اختلاف رہا۔ مولوی اور مسٹر کی یہ تفریق اتنی بڑھی کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل پر کبھی اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوئے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ قیام علی گڑھ سے قبل مسلمان ملت مذہب اسلام کو، اسلامی علوم کو اور اسلامی تہذیب کو سب سے افضل اور اعلیٰ تصور کرتی تھی۔ جس کی بنیاد کتاب ہدایت قرآن مجید اور آخری اسوہ ہدایت سنت رسول پر تھی۔ بتدریج علی گڑھ سے فارغ شدہ طلبہ کے ذہنی نظریات میں تغیر آنے لگا۔ اب وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب کو سب سے افضل قرار دینے لگے۔ قدیم نظام تعلیم جامع تھا دینی تعلیم بھی اور دنیاوی تعلیم بھی تھی۔ دینی تعلیم میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، ادب سب شامل تھا۔ تعلیم پر آٹھ سال صرف ہوتے تھے۔ دینی علوم کے ماہر کو عالم اور دنیوی علوم کے ماہر کو دانشمند کہتے تھے۔ دونوں علوم کے ماہر کو عالم فاضل کہتے تھے۔ علی گڑھ میں اتنے بڑے نصاب کا خلاصہ ایک کتاب دینیات کی شکل میں پیش کردیا گیا پھر وہ سارے اسلامیہ اسکولوں میں جاری کردی گئی مکمل اسلامی نصاب سے رخصت مل گئی۔

مراجع وحواشی

(۱) البقرۃ۲:۳۰ (۲) البقرۃ۲:۳۱ (۳) محمد احمد صدیقی، اقبال کے تعلیمی نظریات، ص۲۱۷، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ

(۴) علق۹۶: ۱تا۵ (۵) محمد سلیم، سید، پروفیسرؒ مشنری تعلیمی اداروں کا تنقیدی جائزہ، ص۱۳، ۱۲

(۶) منور جہاں رشید، قدیم اسلامی مدارس، ص۹، مجلس ترقی ادب لاہور

(۷) تعمیر افکار، سید سلیم نمبر، ص۳۳۱ بحوالہ پروفیسر احمد شیر اعوان/پروفیسر سید محمد سلیم، علم التعلیم (حصہ اول) ص۲۶

(۸) نعیم صدیقی، تعلیم کا تہذیبی نظریہ، ص۲۱۶، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، مئی ۲۰۰۹

(۹) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، Vol:18/2، ص۱۶۰ (۱۰) سورۃ آل عمران،۱۶۴

(۱۱) منور جہاں رشید، ایضاً، ص۳۰، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۲) ایضاً، ص۳۱

(۱۳) محمد سلیم، سید، پروفیسر، اذکار سیرت، ص۱۰۱، زوار اکیڈمی پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء

(۱۴) منور جہاں رشید: ایضاً، ص۳۵، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۵) سعید اختر، پروفیسر، مسلمانوں کا نظام تعلیم، ص۱۲، ۱۳

(۱۶) منور جہاں رشید، ص۳۷ (۱۷) ایضاً، ص ۳۸

(۱۸) شبلی نعمانی، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۱۹) منور جہاں رشید، ص۴۵، ۴۶

(۲۰) محمد فیروز شاہ، پروفیسر، ماہنامہ نور اسلام، شرق پور شریف (گولڈن جوبلی نمبر) ص۲۸۵، اشاعت ۲۰۰۶

(۲۱) ایضاً، ص۲۸۶ (۲۲) ڈاکٹر غلام جیلانی مخدوم، تاریخ اسلام، ص۶۰۸ (۲۳) ایضاً، ص۶۱۰

(۲۴) ایضاً، ص۶۳۵ (۲۵) ماہنامہ نور اسلام، شرق پور شریف، ص۲۹۴، اشاعت ۲۰۰۶

(۲۶) خورشید احمد، پروفیسر، نظام تعلیم، روایت، مسائل، ص۷۰ (۲۷) ماہنامہ نور اسلام، ص۲۹۷، اشاعت ۲۰۰۶

(۲۸) نظام تعلیم، روایت، مسائل، ص۹۷ (۲۹) ماہنامہ نور اسلام، ص۲۹۷ (۳۰) ایضاً، ص۲۹۸

(۳۱) ایضاً، ص۲۹۹ (۳۲) ایضاً، ص ۳۰۰ (۳۳) نظام تعلیم، روایت، مسائل، ص ۹۸

(۳۴) ایضاً، ص۹۹ (۳۵) محمد طیب، مولانا، تاریخ دار العلوم دیوبند، ص۱۹، دار الاشاعت کراچی (۳۶) ایضاً، ص۱۰۱

(۳۷) محمد سلیم، سید، پروفیسر، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص۲۵۱، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، مطبع ۱۹۸۰

(۳۸) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج۲/۱۴، ص ۱۵۵، ۱۵۶، پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۳۹) محمد اکرم، شیخ، موج کوثر، ص۸۸، ادارہ ثقافہ اسلامیہ لاہور

(۴۰) مولانا حالی، حیات جاوید، ص۱۶۹، عشرت پبلشنگ ہاؤس، اگست ۱۹۷۱ (۴۱) ایضاً، ص۵۷۶

(۴۲) علی گڑھ کی علمی خدمات، ص۶۶ (۴۳) اس روایت کو حدیث کے عالم ضعیف قرار دیتے ہیں۔

(۴۴) محمد اکرم، شیخ، موج کوثر، ص۶۰

(۴۵) محمد سلیم، سید، پروفیسر، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص۲۷۸، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور، فروری ۱۹۹۳

(۴۶) محمد سلیم، سید، پروفیسرؒ مسلمان اور مغربی تعلیم، ص۱۸۹، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور، ۱۹۸۹ء

(۴۷) رسالہ ندوۃ، اشاعت ۷ مارچ ۱۹۰۹ء، بحوالہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی

(۴۸) محمد سلیم، سید، پروفیسر، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص۲۸۸، فروری ۱۹۹۳ء

(۴۹) ایضاً، ص۲۸۹، ۲۹۰ (۵۰) ایضاً، ص۲۸۳ (۵۱) ایضاً، ص۲۸۴